چنبیلیوں کا شہر

مجموعۂ غزل



سیّد ناصرؔ چشتی

چنبیلیوں کا شہر

مجموعۂ غزل

سیّد ناصؔر چشتی



یونیک لرننگ اکیڈمی

فہرست

غزل

جب درد نہ ہو دِل میں تو لذّت نہیں مِلتی
یُوں بیٹھے بٹھائے ہی یہ دَولت نہیں مِلتی

اِس کا تو تعلّق ہے بہر طور دِلوں سے
بازاری دُکانوں سے محبّت نہیں مِلتی

پڑتی ہُوئی لگتی ہیں تعلّق میں دراڑیں
جِس روز ترے لب پہ شکایت نہیں مِلتی

مِل جاتے ہیں چوروں کو سرِ راہ خزانے
مزدُور کو محنت کی بھی اُجرت نہیں مِلتی

اللہ کی یکتائی پہ دال نہیں کیا یہ
انسان کی انسان سے صورت نہیں مِلتی

پہچان کا پیمانہ نیا ڈھونڈنا ہو گا
اب آنکھیں تو مِلتی ہیں بصارت نہیں مِلتی

ناصؔر یہ اُسی ذات کا احسان ہے ورنہ
ہر ایک کو ہر گام پہ شُہرت نہیں مِلتی

غزل

لمحوں کو نہ پابندِ رفتار کِیا جائے
کیوں اَور سفر اپنا دُشوارا کِیا جائے؟
تاریک فضاؤں کو سورج کا بدل کہہ کر
اَب اَور نہ موسم کو بیمار کِیا جائے
حُجرے میں چھُپی باتیں کیا دال نہیں اِس پر؟
واعظ کو سرِ ممبر سنگ سار کِیا جائے
شاید کہ کمی آئے نفرت کے اندھیروں میں
سورج کی طرح روشن کردار کِیا جائے
سِکھلایا سبق ہم کو سرکارِ دوعالم ﷺ نے
چُھپ کر تو نہ دشمن پر بھی وار کِیا جائے
پڑنے جو نہیں دیتا جُھگیوں پہ کرن کوئی
ہر ایک محل ایسا مسمار کِیا جائے
سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑتے رہنے سے
سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کِیا جائے
ناصؔر یہ محبّت ہی ہے سفر اُجالوں کا
پِھر کیوں نہ محبّت کا پرچار کِیا جائے

غزل

پستیوں کو ارتقا کہتے رہے
تھی گُھٹن لیکن ہوا کہتے رہے

ہم نے مقصد پر توجّہ دی نہیں
کربلا تھی کربلا کہتے رہے

آج تک سوچا نہیں سمجھا نہیں
اصل کیا تھا اَور کیا کہتے رہے

دِل میں کتنی نفرتیں اُگتی رہیں
کر بھلا ہو گا بھلا کہتے رہے

ہم قصیدہ دوسروں کی مرگ پر
اپنے ہی مرحُوم کا کہتے رہے

جانے والے پر اُٹھائیں اُنگلیاں
آنے والے کو خُدا کہتے رہے

ہو گیا جس وقت کوئی سانحہ
کیوں ہُوا کیسے ہُوا کہتے رہے

چور کا ہم نے تعاقب کب کیا؟
یہ گیا اور وہ گیا کہتے رہے
آج تک نہ مارا ناصؔر ایک بھی
سانپ تھا رے سانپ تھا کہتے رہے

غزل

مانند وہ ہوا کے مُجھے چھوڑ کر چلا گیا
خوشبو تھا وہ دماغ کے اندر چلا گیا

تصویر کے نصیب میں اس کی کھنک کہاں؟
بُت کو یہیں پہ چھوڑ کے کافر چلا گیا

وہ تھا اُسی کے نام پہ اِک جام آخری
جس کو لگا کے آج وہ ٹھوکر چلا گیا

جُھکنا کسی کے سامنے گویا تھی خود کشی
محسوس یُوں ہوا کہ مِرا سَر چلا گیا

پھر اس کے بعد ہم کبھی گھر کے نہیں رہے
مہماں وہ ایک رات کا جب گھر چلا گیا

آنکھیں کھُلیں تو صِرف تھا بِکھرا ہُوا بدن
جانے کہاں وہ خواب کا منظر چلا گیا

دِل میں دوبارہ وہ کبھی ناصؔر نہ آ سکا
جو شخص اِس مکان سے باہر چلا گیا

غزل

خوشبو، وفا کے پھول کی آواز میں مِلا
سُر کوئی میرے پیار کے تُو ساز میں مِلا

اس گُلستاں کو دیکھنا چاہوں سدا بہار
انجام کا سرُور بھی آغاز میں مِلا

ہر چاند کے نصیب میں ہوتی ہے چاندنی
میری نظر کا حُسن بھی انداز میں مِلا

شاید تُجھے نہ چاٹ لے کافر نظر کوئی
میری نیاز بھی ذرا اِس ناز میں مِلا

وہ راز راز ہی نہیں پا لے جو دوسرا
بُھولے سے بھی نہ غیر کو اِس راز میں مِلا

تلوار کی مثال ہے تحریر کا مزاج
لہجے کی یار چاشنی الفاظ میں مِلا

عُجلت کے بعض فیصلے آتے ہیں کاٹنے
ناصؔر سبق یہ پیار کے آغاز میں مِلا

غزل

سفر کا سلسلہ باندھا گیا ہے
مِرے پَیروں سے کیا باندھا گیا ہے
سمندر اَور کاغذ کی یہ ناؤ
ہواؤں سے دِیا باندھا گیا ہے
کِھلیں گے ٹہنیوں پر بھی شرارے
کہ لو کو بھی صبا باندھا گیا ہے
لُٹیرے محتسب ہیں یا الٰہی!
اندھیرے کو ضیا باندھا گیا ہے
کُھلا چھوڑا گیا چوروں کو لیکن
محافظ کا گلا باندھا گیا ہے
ہِلا اب تک نہیں عرشِ مُعلّیٰ
مِرا حرفِ دُعا باندھا گیا ہے
مُجھے انسان سے شکوہ یہی ہے
کہ انساں کو خُدا باندھا گیا ہے

خطا آنکھوں نے کی یا دِل نے کی ہے
مُجھے دے کر سزا باندھا گیا ہے
نقیبِ عہدِ نو تھے ہم بھی ناصؔر
ہمیں ہی بے نوا باندھا گیا ہے

غزل

مُجھے معلوم تھا یُوں بھی محبّت کا صِلہ دے گا
مُجھے گُزرا ہُوا لمحہ سمجھ کر وہ بُھلا دے گا

اپاہج ساعتوں کو ساتھ لے کر مَت سفر کرنا
نہ منزل ہاتھ آئے گی نہ کوئی راستہ دے گا

مُجھے معلوم تھا اِس دَور میں یہ دَور آنا ہے
کہ رہ زَن لُوٹ لے گا لُوٹ کر پھر حوصلہ دے گا

وفا اُس کے سلیبس میں فقط اِک عارضی شے ہے
مگر جو درد بھی دے گا یقیناً دیرپا دے گا

خُدا کا ایک دروازہ ہمیشہ سے کُھلا دیکھا
خُدا سے برملا مانگو تُمھیں وہ برملا دے گا

ہمارے شہر کا قانون بھی آنکھیں نہیں رکھتا
جو خود اندھا ہے وہ تو تیری آنکھیں بھی بُجھا دے گا

اندھیرا کس قدر ہے بیخ پا تاروں کی جھلمل پر
تُمھیں جلتا ہُوا تاروں کی سینہ ہی پتا دے گا

ضروری تو نہیں ہر ایک دَر سے بھیک بھی آئے
مگر جس در پہ جائے گا گدا ناصؔر دُعا دے گا

غزل

بے وفا کے اثر میں رہتا ہے
میرا دِل بھی بھنور میں رہتا ہے

ہر خبر کے ہیں ایک سے تیور
جیسے ہر اِک خبر میں رہتا ہے

آج آیا ہے پُوچھنے خود وہ
درد بن کے جگر میں رہتا ہے

میرا چہرہ بھی میرا چہرہ نہیں
جب سے وہ چشمِ تر میں رہتا ہے

نیچی پرواز رکھنے والوں کی
اپنا گھر بھی نظر میں رہتا ہے

شام لائے گی جانے کیا کیا کُچھ
ایک کھٹکا سحر میں رہتا ہے

اس کو گھر گھر میں ڈھونڈنے والے
وہ تو تیرے ہی گھر میں رہتا ہے

وہ ہزاروں میں رہ کے ہے یکتا
سُرخی بن کے خبر میں رہتا ہے
وہ ہوا ہے مِلے گا کیا ناصؔر؟
اِک مسلسل سفر میں رہتا ہے

غزل

کیا کسی کا قصور ہے بھائی
اپنی منزل ہی دُور ہے بھائی

تیرے سجدے بھی رِشوتوں جیسے
تیری نظروں میں حُور ہے بھائی

رشک کرنا تُجھے نہیں آتا
یہ حسد تو فتور ہے بھائی

زندگی کی رمق تو باقی ہے
تیرا مُردہ شعور ہے بھائی

تیرا رب تو قریب ہے تیرے
تُو ہی خود اُس سے دُور ہے بھائی

اِس جگہ پر جو سانپ بیٹھے ہیں
کچھ خزانہ ضرور ہے بھائی

یہ جو ناصرؔ تُو جھوم اُٹھا ہے
تیرے فن کا سرُور ہے بھائی

غزل

دُشمنی دُشمن کرے اَور دوست عیّاری کرے
کس سے رکھے ربط کوئی کس سے غم خواری کرے

اپنے سائے سے بھی اُس کو لازمی ہے احتیاط
مُخبری خود جس کے گھر کی چاردیواری کرے

دوستوں نے دوستی سے یُوں کِیا حُسنِ سلوک
آدمی کو جس طرح لاچار بیماری کرے

ہم خُدا سے مانگتے ہیں بندگی کا یُوں صلہ
جس طرح بازار میں بیوپار بیوپاری کرے

ایک انساں پر مُسلّط سَو طرح کے درد ہیں
وحشتیں چاٹیں لہُو اَور ظُلم سرداری کرے

آ گیا سوداگروں کے ہاتھ دِل جیسا نگیں
جس کا جی چاہے وہ آئے اَور خریداری کرے

یُوں ورق گردانیاں کی ہیں کتابِ حُسن کی
جیسے کوئی امتحاں کی شب کو تیّاری کرے

مُنتظر ہُوں مَیں اُسی کا جِس نے پھر آنا نہیں
کیا خبر کہ اَور کیا کیا رنگ دِلداری کرے!
اُس کی ناصؔر اِس ادا کو کیا کہُوں کچھ تو کہو
ٹوٹ کر چاہے بھی مُجھ کو وار بھی کاری کرے

غزل

خریدی پھر پریشانی نہ جائے
کہ دِل کی بات ہی مانی نہ جائے
یہ آنکھیں موند لینے سے تو ہرگز
کبھی جسموں کی عُریانی نہ جائے
ڈِبو سکتا نہیں طوفان اس کو
جو اندر ناؤ کے پانی نہ جائے
تُو کیا آباد ویرانے کرے گا
اگر گھر سے ہی ویرانی نہ جائے
امیرِ شہر سے اُلجھیں تو کیسے؟
کبھی اُونچی جگہ پانی نہ جائے
بُجھا سکتے نہیں شُعلوں کو آنسو
کبھی منّت سے طغیانی نہ جائے
شناسائی کریں کیا تجُھ سے ناصؔر
تری صورت ہی پہچانی نہ جائے

غزل

اتنا پیارا وہ یار لگتا ہے
ایک ہو کر ہزار لگتا ہے
روشنی کا لگا ہُوا میلہ
دُور سے تو غُبار لگتا ہے
مُفلسی کا شکار ہر بندہ
چلتا پھرتا مزار لگتا ہے
ہو عدالت یا کوئی تھانہ ہو
ظُلم پر ہی نکھار لگتا ہے
ہاتھ دِل پر ہے مرنے والے کا
دوستی کا شکار لگتا ہے
خاص مُہرہ ہے میرے دشمن کا
وہ جو یاروں کا یار لگتا ہے
آئینے کو نہ توڑ اے ناصرؔ
یہ تو سچ سے فرار لگتا ہے

غزل

طبیعت آج گھبرائی بہت ہے
تُمھارے بعد تنہائی بہت ہے

یہی میرے لیے بھائی بہت ہے
غموں سے جو شناسائی بہت ہے

مِرے ظُلمت گزیدہ پیار نے ہی
تُمھاری ذات چمکائی بہت ہے

چلو دُشمن ہی وہ تسلیم کر لے
ہمیں اتنی پذیرائی بہت ہے

نہیں دیتا کوئی تُجھے میں غم بھی
قیامت ہے کہ مہنگائی بہت ہے

قیافوں سے وفا پائی نہ جائے
کہ اِس دریا کی گہرائی بہت ہے

اسے کیوں بے وفا کہتی ہے دُنیا
یہ دُنیا بھی تو ہرجائی بہت ہے

ہے سچّا قول داناؤں کا ناصؔر
ہو یوسف سا تو اِک بھائی بہت ہے

غزل

اِک ہم راز نے راز ہمارا کم فہموں میں بانٹ دِیا
اپنے ہاتھ سے اِک خزانہ خود چوروں میں بانٹ دِیا

کتنے غُصّے سے ٹکرایا سر طوفانوں نے ساحل سے
ہم نے اپنا آپ سفینہ خود لہروں میں بانٹ دِیا

آج وہ آنکھیں اَور کسی کے چہرے پر آویزاں تھیں
ہم نے اپنی آنکھ کا منظر جن آنکھوں میں بانٹ دِیا

کیا مِل بیٹھ کے سوچیں گے ہم؟ کس نے آج کے انساں کو
پہلے بانٹ دِیا نسلوں میں پھر فرقوں میں بانٹ دِیا

دامن زخمی، ہاتھ بھی زخمی، زخمی زخمی شاخیں ہیں
پتھریلا پَن جانے کس نے اِن پھولوں میں بانٹ دِیا

دیوانے کو دیوانہ اَب کہنے والا کوئی نہیں
دیوانے نے دیوانہ پَن فرزانوں میں بانٹ دِیا

اِس سے بڑھ کر اَور سخاوت کیا کر سکتا ہُوں ناصؔر
مَیں نے اپنی شُہرت کو بھی کچھ لوگوں میں بانٹ دِیا

غزل

تُجھ کو دِل میں سنبھال رکھا ہے
تیرا کتنا خیال رکھا ہے!

آ بھی جاؤ کہ کل کے وعدے پر
موت کو ہم نے ٹال رکھا ہے

اُس کو چھونے سے لگتا ہے ایسا
ہاتھ شُعلوں میں ڈال رکھا ہے

اُس نے رَکھ دیں جواب میں آنکھیں
ہم نے جو بھی سوال رکھا ہے

یہ نہ پوچھو بچھڑتے لمحوں میں
ہوش کیسے بحال رکھا ہے

زندگانی کا حسین تر لمحہ
تیرے کھاتے میں ڈال رکھا ہے

مَیں نے ناصرؔ کسی کے پیکر کو
اپنی غزلوں میں ڈھال رکھا ہے

غزل

آئینہ اِک تیرے برابر لے آؤں
تیرے لیے مَیں تیرا ہمسَر لے آؤں
پڑ جائیں گی ماند یہ چنچل روشنیاں
پہلُو سے مَیں دِل جو باہر لے آؤں
فرعونوں کو کر دوں حوالے نِیل کے مَیں
نمرودوں کے واسطے مچّھر لے آؤں
پہن کے جو پھرتے ہیں شُعلے اُن کے لیے
شوخ ہوا کا کوئی لشکر لے آؤں
ہم دونوں تنہائی گزیدہ لگتے ہیں
کاش مَیں اس کو اپنے ہی گھر لے آؤں
دیکھوں تو وہ خود کتنے پانی میں ہے؟
وہ شیشہ ہے اَور مَیں پتّھر لے آؤں
کاش وہ مُجھ کو کہہ دے اُس کے پیکر سے
ناصؔر اپنی غزل سجا کر لے آؤں

غزل

ایک تِنکا جو سب سے کمتر ہے
تیز آندھی میں سب سے بہتر ہے

چاند سے بھی ہزارہا درجہ
اِس زمیں کی جبیں مُنوّر ہے

جیسے مَیں ہی تِرا پُجاری ہُوں
جیسے تُو ہی مِرا مُقدّر ہے

تیرے سب رُوپ ہی نرالے ہیں
تُو وفاکیش یا ستمگر ہے

ایک زردار کہہ رہا تھا کل
وہ ہی خوشحال ہے جو بے زَر ہے

خود بلائیں بھی کہہ رہی ہیں اَب
بابا دُنیا بلاؤں کا گھر ہے

آسماں سے کوئی اگر دیکھے
یہ زمیں بھی تو اِک سمندر ہے

سب اُجالا بھی، سب اندھیرا بھی
خیروشر سب تمُھارے اندر ہے
تیری نسبت نے ہی تو چمکایا
کوئی سرور کوئی سکندر ہے
سادگی سے تُو پیار کر ناصؔر
یہ تو انسانیت کا زیور ہے

غزل

جس وقت آنکھ آپ کی مَے خانہ ہو گئی
ساری فضا کی کیفیت رِندانہ ہو گئی

عُریانیاں بکھیرتا آیا وہ سامنے
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

اَب گھومتی ہے ایک ہی شمع کے اِردگرد
اِک شخصیت کی شاعری پروانہ ہو گئی

ہوتا ہے سال بعد ہی اِک بار سامنا
اَب دید کی نوید بھی سالانہ ہو گئی

دیکھا جو اُس کا عکس تو ہم جُھومنے لگے
بہتی ندی بھی آج تو پیمانہ ہو گئی

اُس کا خیال آتے ہی ناصؔر ہوئی غزل
کاوش ہماری عشق کا نذرانہ ہو گئی

غزل

ہم غریبوں کو بھی دو دِن زندگانی چاہیے
آخر ہم کو بھی کسی کی مہربانی چاہیے

گو نئی ہر چیز کی ہوتی ہے سَج دَھج بھی نئی
ہم فقیروں کو وہی کٹیا پرانی چاہیے

کر لِیا ہے قلب و سینہ و جگر کو داغ داغ
اَے غمِ دوراں تری کچھ تو نشانی چاہیے

بُلبلِ آشفتہ جاں کو کیا تعلّق خار سے
اِس کو فصلِ رنگ و بُو کی حکمرانی چاہیے

سادگی سے کون قائل کر سکے گا حُسن کو
اس کی محفل میں ذرا جادُو بیانی چاہیے

شدّتیں ہر حال میں ہیں باعثِ حُزن و ملال
ہر وَتیرہ زندگی کا درمیانی چاہیے

روتے روتے ہو گئے ہیں خُشک چشمے آنکھ کے
کشتِ اُلفت کو ابھی تو اَور پانی چاہیے

حُسنِ یُوسف اوڑھ کر آئے وہ ناصؔر بزم میں
اب تو لازم ہے زلیخا کو جوانی چاہیے

غزل

حسرتوں میں کٹ گئے ہیں زندگی کے چار دن
خواب ہو کر رہ گئے ہیں زندگی کے چار دن
خود سے ملنے کی فراغت بھی کسی کو اب نہیں
کس قدر مصروف ہیں ہر آدمی کے چار دن
تھے اُجالوں کے تعاقُب میں اندھیروں کے ہجوم
کس قدر بے کیف گُزرے روشنی کے چار دن
چلتے چلتے اِک ڈگر پر زندگی اُکتا گئی
تھے وہ بچپن میں عجب آوارگی کے چار دن
سیج پھولوں کی ہو یا کانٹوں کا بستر کچھ بھی ہو
کٹ ہی جاتے ہیں مِری جاں ہر کسی کے چار دن
ڈھونڈتے ہی ڈھونڈتے نت روز چہرہ اِک نیا
میرا کیا؟ بے کار گزرے آپ ہی کے چار دن
دُشمنی پھر دُشمنی ہے دوستی پھر دوستی
دُشمنی میں کیوں گزاریں دوستی کے چار دن
یہ تخیّل کی روانی اور جذبوں کی اُٹھان
کر لے ناصؔر ہیں یہی تو شاعری کے چار دن

غزل

اپنے خول میں ہی چُھپ جانا اچھا ہے
اپنے دُکھ سے دِل بہلانا اچھا ہے
کون یہاں دیتا ہے بھیک اُجالوں کی؟
گھر میں اپنا دِیپ جلانا اچھا ہے
کُھل کر سانس بھی لینے پر ہے پابندی
اِس بستی سے تو ویرانہ اچھا ہے
ملاّحوں کی منّتیں کرتے رہنے سے
طوفانوں میں ڈوب ہی جانا اچھا ہے
نفرت کی ترغیب جہاں پر ملتی ہو
ایسی مسجد سے مَے خانہ اچھا ہے
دَولت مندی باعث ہے بے چینی کا
اَور غربت کا خواب سُہانا اچھا ہے
تا کہ پھر سے بہاریں مُنظّم ہو جائیں
کہتے ہیں پت جھڑ کا آنا جانا اچھا ہے

ریشم اَور کم خواب کے گاؤ تکیوں سے
اپنے بازو کا سرہانہ اچھا ہے
جس میں ناصؔر خیمہ زن ہو بے تابی
ایسے گھر کو آگ لگانا اچھا ہے

غزل

تپتے صحرا کی وہ دِل کو آگ لا کر دے گیا
لے کے مُجھ سے بادِ راحت بادِ صرصر دے گیا
ایک تو صورت تراشو میرے پیکر سی کوئی
آزمانے کو ہمیں وہ سنگِ مرمر دے گیا
ہم جسے سوغات پھولوں کی سدا دیتے رہے
جاتے جاتے وہ ہمیں نفرت کے پتّھر دے گیا
دے کے مُجھ کو بھیگے بھیگے آنسوؤں کے سلسلے
خوش ہے لیکن جیسے مُجھ کو آبِ کوثر دے گیا
کون تھا جو دیس میرے کی محبت کے امیں
سارے خادم لے گیا بے کار افسر دے گیا
چھین کر مُجھ سے سسکتی مُفلسی کی آن بان
پتھروں کی سرزمیں میں شیشے کا گھر دے گیا
حالتِ دِل ہے دگرگوں گرچہ اَے ناصؔر مری
درد پہلے سے مگر وہ مُجھ کو بہتر دے گیا

غزل

شانوں پہ کسی اَور کا سر اوڑھ کے چلنا
دُنیا میں نمائش کا ہُنر اوڑھ کے چلنا

پھر آئے گا کچھ لُطف تمھیں سیرِ چمن کا
ہمراہِ صبا حُسنِ نظر اوڑھ کے چلنا

اِس حُسنِ مُجسّم کی یونہی مانگ بڑھے گی
تنہائی اذیّت ہے مگر اوڑھ کے چلنا

مُمکن ہے کہ کُچھ دادِ سفر تُم کو بھی مِل جائے
اَے راہرو! گردِ سفر اوڑھ کے چلنا

اِس برف کے موسم میں ٹھٹھر جاؤ گے ورنہ
تُم ذوقِ تجسُّس کے شرر اوڑھ کے چلنا

کترا کے گُزر جائیں گے طوفان بھی تُم سے
تُم بحر کے سینے پہ بھنور اوڑھ کے چلنا

طعنہ تو تُجھے خانہ بدوشی کا ملے گا
تُم لاکھ یہ ٹُوٹا ہُوا گھر اوڑھ کے چلنا

سچ مانو یہ ہستی کی نگہبان ہے ناصؔر
تُم موت کو بے خوف و خطر اوڑھ کے چلنا

غزل

دو قدم جس سے عیادت کو بھی آیا نہ گیا
اِک وہی بندہ کبھی دِل سے بُھلایا نہ گیا

لاکھ ہونٹوں پہ تبسّم کے گرائے پردے
اَے غمِ یار مگر تُجھ کو چُھپایا نہ گیا

بوجھ سر کا کوئی بھاری تو نہ تھا شانوں پر
پست ہمّت سے مگر یہ بھی اُٹھایا نہ گیا

کس طرح گھر کو بسائیں گے یقیں کیسے کریں؟
عُمر بھر دِل کا نگر جن سے بسایا نہ گیا

ٹہنیاں کاٹ کے جو لے گئے اس کی یارو!
اُن کے سر سے بھی کبھی پیڑ کا سایہ نہ گیا

رَکھ دیا نام جو غربت نے زمانے گُزرے
لوحِ تقدیر سے پھر اس کو مٹایا نہ گیا

اِتنے برسے ہیں ترے شہر میں پتّھر ہم پر
تیرے دامن میں بھی سر ہم سے بچایا نہ گیا

خالی ماچس کی طرح دِل کو ہے پھینکا ناصؔر
اِتنی شدّت سے کہ تاعُمر اُٹھایا نہ گیا

غزل

لوگ ہیں کچھ بہکے بہکے آج بھی
ہیں نشے میں چور لمحے آج بھی

کتنی مہنگی ہیں سکوں کی گولیاں
ہَیں جہاں میں درد سستے آج بھی

آج بھی ہیں اپنے گھر تاریکیاں
اُس کے گھر میں چاند اُترے آج بھی

کل بھی لب تھے خُشک صحرا کی طرح
آ کے بادل پھر نہ برسے آج بھی

جب بھی سورج ڈُوبتا ہے یُوں لگے
تھک گئے ہوں آپ جیسے آج بھی

دِن دیہاڑے ڈاکوؤں کی آڑ میں
لُوٹ لیتے ہیں یہ رستے آج بھی

آنکھ پانی پانی کرتی رہ گئی
پی کے آنسو جلتے جلتے آج بھی

آ کے پُوچھا تک نہیں ناصؔر ہمیں
کیسے ہو؟ وہ کاش کہتے آج بھی

غزل

اُس کو دیکھا تھا لمحہ بھر کے لیے
دِل میں آیا تھا لمحہ بھر کے لیے

پُوچھا کرتی ہے اب بھی تنہائی
کون آیا تھا لمحہ بھر کے لیے؟

رُوبرو تھا وہ آئینہ صورت
وہ بھی لمحہ تھا لمحہ بھر کے لیے

ہم کو رونا پڑا مہینوں تک
جب وہ بِچھڑا تھا لمحہ بھر کے لیے

درد صدیوں کے دے گیا وہ ہمیں
جِس کو چاہا تھا لمحہ بھر کے لیے

کتنے تارے سسکتے چھوڑ گیا
چاند نکلا تھا لمحہ بھر کے لیے

رقُص کرتے رہے بھنور برسوں
مَیں تو ڈوبا تھا لمحہ بھر کے لیے

رات ساری وہ اپنی کہتا تھا
میری سُنتا تھا لمحہ بھر کے لیے
آنکھیں مَلتے گُزر گئی اپنی
اُس کو دیکھا تھا لمحہ بھر کے لیے
اب بھی ہوتی ہے گُدگدی لب پر
گُل کو چوما تھا لمحہ بھر کے لیے
گھر میں ہوتی تھی کس قدر رونق
جب وہ آتا تھا لمحہ بھر کے لیے
اُس کو سوچا ہے مُدّتوں ناصؔر
جِس کو دیکھا تھا لمحہ بھر کے لیے

غزل

اَشک شام و سحر بہاتا ہُوں
جھونپڑی میں دِیے جلاتا ہُوں
گُزرے قصّے سُناؤں کیا تُجھ کو؟
بات کرتا ہُوں بھول جاتا ہُوں
شب بِتانے کو دِیپ اِس گھر کے
کچھ بجھاتا ہُوں کچھ جلاتا ہُوں
ایک لمحہ ہُوں وقت کی رو میں
دھیرے دھیرے گُزرتا جاتا ہُوں
سنگ آتے ہیں اُن کی جانب سے
اپنی وحشت کی داد پاتا ہُوں
کوئی مقصد نہیں مگر یُوں ہی
اُن کی گلیوں میں آتا جاتا ہُوں
کتنا اُلجھا ہُوا ہُوں مَیں ناصؔر
ایک بنیئے کا جیسے کھاتا ہُوں

غزل

راستہ کوئی بھی اُس کے شہر کو جاتا نہ تھا
یا مُجھے دیوانگی میں کچھ پتہ چلتا نہ تھا

تُجھ سے پہلے میرے گھر کا آسماں تاریک تھا
تارے بھی چمکے نہ تھے اَور چاند بھی نکلا نہ تھا

دھوپ سے بچنے کی خاطر مَیں نے سینچا پیڑ کو
جس گھڑی خورشید چمکا میرے گھر سایہ نہ تھا

چھوڑ دے ان کو کبھی یہ چھوڑ جائیں گے تُجھے
دُنیا والے ہیں یہ اے دِل مَیں تُجھے کہتا نہ تھا!

بیچ ڈالی تھی غریبی کے عوض اپنی انا
ورنہ میرا کوئی جذبہ اِس قدر سستا نہ تھا

احتجاجاً ہو گئے تھے خار جاں کے درپئے
انتقاماً مَیں نے تو کلیوں کا مُنہ چُوما نہ تھا

کر دِیا تھا اس طرح تنہائی نے مُجھ کو اسیر
دِل کسی رنگین محفل میں کبھی لگتا نہ تھا

کل بھی اِک طوفان کی قدآوروں سے ٹھن گئی
تھا سلامت وہ شجر ہی جس کا سر اُونچا نہ تھا
مُفلسی نے دوستوں میں جتنا پستہ کر دِیا
ورنہ قدرت کا دِیا تو اِس قدر چھوٹا نہ تھا
اہلِ زر نے آبِ زر سے کر لیے روشن دِیے
اپنی قسمت کے دِیے میں تیل بھی جلتا نہ تھا
خط میں لِکھتا تھا جو ناصؔر بارہا اپنا پتہ
تھا بڑا مکّار وہ اُس شہر میں رہتا نہ تھا

غزل

سارے فِتنے شور شرابے جاگ اُٹھے ہیں محشر کے
جِن کو باہر ڈھونڈ رہے ہو چور وہی ہیں اندر کے

آئینے کو توڑ کے جتنے ٹُکڑوں میں تقسیم کِیا
کِرچی کِرچی میں بیٹھے ہیں چہرے میرے پیکر کے

آؤ دیکھ تو لیں میداں میں جوہر اپنے ہم دونوں
ہم ہیں زخموں کے بنجارے تُم ہو ماہر خنجر کے

پیار کو رُسوا کرنے والے نکلے محرم راز سبھی
لنکا ڈھانے والے ٹھہرے بھیدی اپنے ہی گھر کے

مانا آپ نہیں ہیں شامل میرے چاہنے والوں میں
پھر کیوں آپ نے کاٹے چکّر برسوں میرے دفتر کے

عشق میں کیسے بات چلے گی دُنیاداری سے اَے دِل
ہیروں کے بیوپار میں کیسے باٹ چلیں گے پتّھر کے

پھول کے نازک ہونٹوں پر بھی زخم ہزاروں جلتے ہیں
آج بھی کھیل رہے ہیں ان سے جھونکے بادِ صرصر کے

پت جھڑ اَور بہار برابر اپنا رنگ دِکھاتے ہیں
دِل میں ناصؔر اُتر گئے ہیں سارے موسم باہر کے

غزل

تِری چلمن سے ٹکرا کر صدا واپس چلی آئی
فلک سے آج بھی خالی دُعا واپس چلی آئی

سحر دم دیکھ کر ٹھنڈے پسینے گُل کے چہرے پر
شِکَستہ خواہشیں لے کر صبا واپس چلی آئی

تُمھارے لوٹ آنے سے مِری گُلزار سوچوں کی
مہکتی گُنگناتی سی فضا واپس چلی آئی

دمِ رُخصت تو اُس نے گو نہ آنے کا کِیا وعدہ
ہوئی جب شامِ فُرقت کی بلا واپس چلی آئی

حسیں نازک سے ہاتھوں کو دُلھن کا رُوپ پہنانے
شفق سے رنگ لے کر پھر حِنا واپس چلی آئی

یہ کیا کم ہے کہ سنّاٹوں کا ٹُوٹا ہے جمود آخر
یہ کیا کم ہے کہ پھر آہ و بکا واپس چلی آئی

اِدھر ہے تیرگی مہماں اُدھر ہے روشنی رقصاں
جو تھی اُس کی مشیّت میں عطا واپس چلی آئی

دِلوں کے ہانپتے کرب و بلا منظر پہ لہرا کر
نہ برسی آج بھی ناصؔر گھٹا واپس چلی آئی

غزل

غم کے دریا کے پار اُتر جائیں
شام کہتی ہے اب تو گھر جائیں
خوشبوؤں کے مزاج میں ڈھل کر
دشتِ احساس میں بکھر جائیں
خود کو تقسیم کر کے لمحوں میں
شہرِ بے صوت سے گزر جائیں
اُگ رہے ہیں دِلوں میں سنّاٹے
اِس گھٹن میں کہیں نہ مَر جائیں
دِل میں بھر لیں اَنا کے انگارے
اِس سے پہلے کہ ہم ٹھٹھر جائیں
جِس کی خاطر تھا ہم نے گھر چھوڑا
اُس کی محفل سے اب کدھر جائیں
آؤ شب کی فصیل پر ناصؔر
صبح رنگیں سی کوئی دَھر جائیں

غزل

پت جھڑ کا بہاروں نے چلن اوڑھ لیا ہے
ہم نے بھی خیالوں کا بدن اوڑھ لیا ہے

اِس دیس کی مٹی سے وفا کون کرے گا؟
لوگوں نے فقط نامِ وطن اوڑھ لیا ہے

غربت میں کوئی عید نہ دہلیز سے گُزری
نادار نے حسرت کا کفن اوڑھ لیا ہے

ننگا نہیں ہونے دِیا فنکار نے خود کو
کپڑے نہ مِلے جب بھی تو فَن اوڑھ لیا ہے

حالات نے برسائے ہیں پتّھر وہ بدن پر
لگتا ہے کہ زخموں کا چمن اوڑھ لیا ہے

سورج کو گوارا نہیں تاروں کا چمکنا
مجبوروں نے پھر چرخِ کُہن اوڑھ لیا ہے

دیکھو یہ حِنا رنگ ہے خطرے کی علامت
ہاتھوں پہ یہ کیا تُو نے دُلہن اوڑھ لیا ہے؟

مالک نے چُھپانے کو کریہہ اپنی شباہت
مزدور سے چھینا ہُوا دَھن اوڑھ لیا ہے
ناؔصر یُوں مِلی داد کہ محفل میں حیا سے
ہر ایک سخنور نے سُخن اوڑھ لیا ہے

غزل

مانگی ہُوئی جنّت سے ویرانہ کہیں اچھا
خیرات کے جینے سے مَر جانا کہیں اچھا
کم فہمی و کم عقلی داناؤں کی جب دیکھی
کہنا ہی پڑا اُن سے دیوانہ کہیں اچھا
دوزخ کے دہانے پر انسان ہیں کاغذ کے
بے کیف حقیقت سے افسانہ کہیں اچھا
مسجد پہ خُدا قابض ہیں فرقہ پرستی کے
اِس بزمِ تعصّب سے مَے خانہ کہیں اچھا
جب کانچ کے ٹُکڑوں سے ہوتے ہوں بدن زخمی
دِل موم کی صورت سے بہلانا کہیں اچھا
دِیوانے کو کم اَز کم پتھّر تو نہیں پڑتے
اِس شہر سے اَے ناصؔر ویرانہ کہیں اچھا

غزل

رات بھر یہ چراغ جلتے ہیں
بھیگی راتوں میں داغ جلتے ہیں
دِل کو برفاب کر لیا لیکن
پھر بھی سینے کے داغ جلتے ہیں
آگ ہر سُو وہ دیکھنا چاہیں
جِن کے اپنے دماغ جلتے ہیں
ناتواں کا ہے یُوں تواں دُشمن
جیسے چِڑیوں سے زاغ جلتے ہیں
اب تو پاؤں میں آبلے بن کر
منزلوں کے سراغ جلتے ہیں
یونہی پت جھڑ ہے موردِ الزام
فصلِ گُل میں بھی باغ جلتے ہیں
چاند پھر چاند ہے میاں ناصؔر
یُوں تو کتنے چراغ جلتے ہیں

غزل

دوستوں کے درمیاں تھا مَیں مگر تنہا رہا
کیسی کیسی محفلوں میں کس قدر تنہا رہا

ہر گلی کُوچے میں ہم نے رونقیں تقسیم کیں
بدنصیبی تھی ہمیشہ اپنا گھر تنہا رہا

ہے خُدا میں اَور مُجھ میں ایک قدرِ مُشترک
وہ اکیلا عرش پر مَیں فرش پر تنہا رہا

جھومتے گاتے رہے وہ اپنی جلوت پر اُدھر
اَور مَیں بے کیف خلوت میں اِدھر تنہا رہا

گو رہا چاروں طرف اُس کے ستاروں کا ہجوم
چاند پھر بھی آسماں پر رات بھر تنہا رہا

شہر کے سب لوگ ناصؔر تھے جنازے میں شریک
لاشہ دِیوانے کا گرچہ دار پر تنہا رہا

غزل

دردکا اِک سلسلہ دِل کے نہاں خانوں میں ہے
آج کل شامِل مِرا سینہ بھی ویرانوں میں ہے

میرے ساغر کو اسی سے بھر دے اَے پیرِ مُغاں
دُشمنِ جاں زہر جو اَوروں کے پیمانوں میں ہے

شکوہءِ بے دار کیسے مَیں کروں حاکم کے پاس
جبکہ ہر اِک چور ظالم اس کے دربانوں میں ہے

دعوتِ شیراز ہے اَور میں ہوں دسترخوان پر
ساتھ شامل یاد اُس کی آج مہمانوں میں ہے

میرے دِل کی وحشتیں بھی آن پہنچیں اِس جگہ
ھُو کا عالم اس لیے شاید بیابانوں میں ہے

پتھروں سے آشنا رکھتے ہیں شانوں پر جو سر
اس قدر فرزانگی تو اب بھی دیوانوں میں ہے

چھین لیتے ہیں درختوں سے لباسِ سبز رنگ
خود پرستی کس قدر کم ظرف طوفانوں میں ہے

کھول اُٹھتا ہے کبھی جو ضربِ استحصال سے
خون ایسا اَب بھی ناصؔر بعض شریانوں میں ہے

غزل

جِن کے سچّے اصول ہوتے ہیں
وہ وفا کے رسول ہوتے ہیں

درد دیتا ہے داد خود جِن کو
وہ ہی آنسو قبول ہوتے ہیں

شوخ لوگوں کی شوخ آنکھوں میں
دِل جلوں کے سکول ہوتے ہیں

تیرے آنے سے ایک مُدّت سے
انتقاماً ملول ہوتے ہیں

دِل ہوں احساس سے تہی جِن کے
اُن سے شکوے فضول ہوتے ہیں

اشک بہتے ہیں جب ندامت سے
رحمتوں کے نزول ہوتے ہیں

ہم کو ہر سال عید پر ناصؔر
غم کے تجھ سے وصول ہوتے ہیں

غزل

کسی کا جو وسیلہ مانگتا ہے
وہ طوفاں سے کنارا مانگتا ہے
یہ ہے سادہ مزاجی انتہا کی
کہ صحراؤں سے دریا مانگتا ہے
ملانا ہاتھ جب مُفلس نے چاہا
تو وہ سمجھے کی پیسہ مانگتا ہے
بُڑھاپے میں وُہی لوٹ آیا بچپن
کہ دِل کوئی کھلونا مانگتا ہے
دِیے کی دیکھیے اعلیٰ مزاجی
کہ مہروماہ سے رشتہ مانگتا ہے!
بتاؤں کیا کہ غربت کے قفس میں
دِلِ نادان کیا کیا مانگتا ہے
یہ ہے انسان کی فطرت ازل سے
کہ ہو جب دُھوپ سایہ مانگتا ہے

کسی کٹیا میں جا کر دیکھ لینا
کہ بچّہ کیسے کھانا مانگتا ہے
مَیں وہ طوفان ہُوں بپھرے جو ناصؔر
پہاڑوں سے بھی رستہ مانگتا ہے

غزل

روشنیوں کے لالچ میں تھی آئی نظر جو سُہانی آگ
کر گئی وہ سب کچھ راکھ تو پھر جا کر پہچانی آگ
اپنے گھر کا یخ بستہ سا موسم بھی اِک نعمت ہے
آخر ہم خوددار بھلا کیوں جا تاپیں بیگانی آگ؟
ایک سے بڑھ کے ایک کرشمہ اِس دُنیا میں دیکھا ہے
دیکھ کے تیرے رُخ کا شُعلہ ہوگئی پانی پانی آگ
بولو تُم کس آگ سے اپنے گھر کو اَور جلاؤ گے
ایک دیارِ غیر کی ہے اَور ایک ہے پاکستانی آگ
مَیں تو اپنی رِیت کے تنکوں سے اِس کو بہلاؤں گا
جانے والا چھوڑ گیا ہے ہجر کی ایک نشانی آگ
جب دِیوارودَر بھی ہمارے مقصد میں ناکام ہُوئے
اپنے گھر کو اپنے ہاتھ سے ہم کو پڑی لگانی آگ
اِس کو خود بھڑکانے والا ہی اِس میں جل جاتا ہے
شعلوں کے ہو رُوپ میں یا پھر ہو کوئی برفانی آگ
آج کی آگ بھی اَور ہے ناصؔر ہم بھی لوگ ہیں اَور کوئی
وہ بھی اَور تھا جس کی چِتا میں کرتی رہی مہمانی آگ

غزل

آج نہیں تو کیا ہے ناصرؔ ہم بھی تھے خوددار کبھی
اپنے پاس بھی تھی اِک دُنیا، تھا اپنا گھر بار کبھی
مَیں نے پُوچھا اِن کھنڈروں سے کچھ تو اپنی تُم بھی کہو
وہ بولے ہم وہ ہیں جہاں پہ لگتے تھے دربار کبھی
دِل پہ سُلگتے زخم سجا کر مَیں اِس آس پہ زندہ ہُوں
یہ بھی پھول بنیں گے اِک دِن بانٹیں گے مہکار کبھی
ہر بُوٹے کے قدموں میں جو ہیں بوسیدہ پھول پڑے
غور سے دیکھو اِن چہروں پر تھی قُربان بہار کبھی
یاد کرو جب ہجر کے لمحے دِیپک چھیڑا کرتے تھے
میری یاد میں آپ کی آنکھیں گاتی تھیں ملہار کبھی
اِن لفظوں کے اندر ہوتے ہیں تخریب کے شعلے بھی
قاتل چور بنا دیتے ہیں لوگوں کو اخبار کبھی
دیکھو یہ جو سر بکھرے ہیں وقت کے قبرستانوں میں
یہ وہ سر ہیں جِن پر رہتی تھی اُجلی دستار کبھی
فرش پہ چلنے والے شاعر کو معراج بھی ہوتی ہے
لے جاتی ہے عرش پہ ناصرؔ سوچوں کی رفتار کبھی

غزل

جنگل ہے مگر جنّتِ اشجار کہاں ہے
اِس دھوپ میں اَب سایۂ دیوار کہاں ہے
دِیوانہ سرِ راہ کوئی پُوچھ رہا تھا
اَے شہرِ ستم بول تِری دار کہاں ہے
افسوس! مِرے بعد کہا چارہ گروں نے
لاؤ تو ذرا سامنے بیمار کہاں ہے
جِس میں کہ مِرے قتل کی رُوداد چھپی تھی
کل شام کا اَے دوست وہ اخبار کہاں ہے
تُم نے تو اسے شہر میں خود بیچ دِیا تھا
اَب ڈھونڈ رہے ہو کہ وہ دستار کہاں ہے
جلوے تو ہر اِک گام پہ موجود ہیں ناصؔر
ہر دِل میں مگر خواہشِ دیدار کہاں ہے

غزل

شہر میں مہکا ہُوا موسم اُترتا دیکھتے
گر شِکَستہ دِل گُلابوں کو نکھرتا دیکھتے

کر نہیں سکتے ہیں جو سچّائیوں کا سامنا
وہ بھلا خورشید کو کیسے اُبھرتا دیکھتے

خود کو تُم محصور پاتے آگ کے ماحول میں
کاش بے کل رتجگوں کو آہیں بھرتا دیکھتے

ڈوبنے کے بعد تھا بے حد ضروری تیرنا
لاش پر کب تک بھنور کو رقص کرتا دیکھتے

آئینہ بھی سوچتا ہم کو رقیبوں کی طرح
ہم جو تُجھ کو آنکھ سے بنتا سنورتا دیکھتے

کاسہ لیسی کا جنوں جِن کو رہا ناصؔر سدا
وہ ہُما کو کیسے سر پر سے گزرتا دیکھتے

غزل

کیوں ہم پہ تری ذات کے تیور نہیں کُھلتے
یہ کیسی قیامت ہے کہ منظر نہیں کُھلتے

ہم نے تو زمانے سے یہی درس لیا ہے
دَولت جو نہ ہو پاس تو افسر نہیں کُھلتے

شکوہ نہیں یاروں سے کہ وہ کُھلتے نہیں ہیں
رونا تو یہی ہے کہ وہ کُھل کر نہیں کُھلتے

ہر شخص کے یہاں دَولتِ ادراک نہیں ہے
ہر شخص پہ ہر شخص کے جوہر نہیں کُھلتے

اُس گھر میں اُترتے نہیں رحمت کے اُجالے
جس گھر میں مناجات کے دفتر نہیں کُھلتے

اِس شہر میں ناصؔر نہ صدا دے کسی در پر
یہ ایسے دریچے ہیں جو اکثر نہیں کُھلتے

غزل

راتوں کی بانجھ کوکھ سے سورج نکال کے
رکھوں گا اپنی زیست کے رستے اُجال کے

میرے تصوّرات کی ناؤ بھنور میں ہے
تُم تو چلے ہو آنکھ کا دریا اُچھال کے

فاقے پہن کے منگتوں کی پُوری کریں مُراد
یہ مرتبے ہیں صرف محمّد ﷺ کی آل کے

یاروں کے جور میں بھی مروّت غضب کی ہے
مُجھ کو جلا رہے ہیں جو سائے میں ڈال کے

نیندوں کی وادیوں میں کبھی آ کے دیکھیے
ہم نے محل بنائے ہیں خواب و خیال کے

فی الحال لفظِ ہجر کی تفسیر کیجئے
پہلو ہیں اَور بھی کئی میرے سوال کے

تاریک راستوں میں یہ چمکیں گے رات بھر
رکھنا ہماری یاد کے جُگنو سنبھال کے

ناصؔر سُنا سُنا کے جدائی کے واقعات
تُو نے گنوا دِیے سبھی لمحے وصال کے

غزل

وہ خود ہی کہیں پیار کا اظہار نہ کر دے
مُجھ کو کسی اُلجھن میں گرفتار نہ کر دے

تقدیر کے پتھراؤ سے دِل ڈول رہا ہے
ٹُکڑے مِری تدبیر کا شہ کار نہ کر دے

پَیروں میں بھنور باندھ کے اَب دھڑکا لگا ہے
یہ رقُص ہی طوفان کو بیدار نہ کر دے

دِن رات عیادت کو مِری آپ کا آنا
ڈرتا ہُوں کہیں آپ کو بیمار نہ کر دے

شُعلہ سا لپکتا ہے کوئی اُس کی ادا سے
وہ راکھ مِری سوچ کا انبار نہ کر دے

زخمی نہ کرو روح کو لہجے کی چھُری سے
یہ زخم تُجھے اَور بھی خوں‌خوار نہ کر دے

پھر آج وہ نکلا ہے مِری ذات پہن کر
پھر کوئی تماشہ سرِ بازار نہ کر دے

ناصؔر ہے ترا آج بھی بے باک سا لہجہ
ٹُکڑے ترے پیکر کے یہ تلوار نہ کر دے

غزل

مال و دولت کے پجاری باوفا ہوتے نہیں
دِل کے چھوٹے لوگ اکثر دِلربا ہوتے نہیں

اتنی جلدی طے کرو مَت دوستی کے مرحلے
ایسے رشتوں کے حوالے دیرپا ہوتے نہیں

یاد آتے ہیں مگر کتنی کفایت اوڑھ کر
ایسے لمحے مجھ سے تو صَرفِ دُعا ہوتے نہیں

ہم فقیروں کو جھڑکنا آپ کی عادت سہی
یہ ہمارا ظرف ہے کہ ہم خفا ہوتے نہیں

ٹہنیوں سے کہہ رہے تھے گلستاں میں خار یہ
کیجئے ہم سے محبت ہم جدا ہوتے نہیں

ایسے چہرے شہر میں تُم کو دکھا سکتا ہُوں مَیں
آشنا لگتے تو ہیں پر آشنا ہوتے نہیں

آ گئے ہو سامنے تو ٹھہر بھی جاؤ ذرا
خوبصورت حادثے نِت رونما ہوتے نہیں

کچھ یقیناً مُجھ سے کہنا چاہتا ہے تُو مگر
خوف کس کا ہے کہ تیرے ہونٹ وا ہوتے نہیں
ایسے ایسے ولولے بھی دِل میں ہوتے ہیں نہاں
لوگ جِن سے خود بھی ناصرؔ آشنا ہوتے نہیں

غزل

دہلیزِ بلوغت پہ ہُنر پہنچ گیا ہے
صد شُکر کہ گھر والا بھی گھر پہنچ گیا ہے
لگ جائے نہ موسم کی نظر اُس کو خُدایا
اب اپنی جوانی کو شجر پہنچ گیا ہے
پھر سونگھتی پھرتی ہیں گِدھیں باس لہُو کی
لگتا ہے کوئی سولی پہ سر پہنچ گیا ہے
دھرتی کو اندھیروں کے سمندر میں ڈبو کر
مہتاب کی دُنیا میں بشر پہنچ گیا ہے
رستوں کا شناسا ہُوں مگر رستہ نہیں مِلتا
انجام کو شاید یہ سفر پہنچ گیا ہے
آئی ہے مِری اپنی صدا مُجھ سے لپٹنے
پھینکا تھا کِدھر تیر کِدھر پہنچ گیا ہے
چُھٹّی ہُوئی دُنیا سے خلوص اَور وفا کی
اَب گھر میں فقیروں کے بھی زَر پہنچ گیا ہے

ملاّح نے چھوڑا بھی تو چھوڑا کہاں پر
جب ناؤ کے پہلو میں بھنور پہنچ گیا ہے
بندوق کا کلچر تو لُٹیروں کا تھا پہلے
اسکول کے بچّوں میں مگر پہنچ گیا ہے
گُزرے گا نہ اَب کوئی بھی آئینے بچا کر
دیوانہ سرِ راہ گُزر پہنچ گیا ہے
اِس بھِیڑ میں کُچلے ہی نہ جائیں ناصؔر
اَب شہر کے ماحول میں ڈَر پہنچ گیا ہے

غزل

نوا کوئی نہیں لیکن نوا کا شور سُنتا ہُوں
مَیں اپنی روح میں تیری صدا کا شور سُنتا ہُوں

یہاں کے لوگ حامل ہیں نہ جانے کس عقیدے کے
فضائے بُت کدہ میں یاخُدا کا شور سُنتا ہُوں

خیال آتا ہے تُجھ کو آزماؤں کچھ طلب کر کے
فقیروں سے مَیں جب تیری عطا کا شور سُنتا ہُوں

خُدا سے خیر مانگو اپنی بستی کے چراغوں کی
مَیں پھر گلیوں میں باہر کی ہوا کا شور سُنتا ہُوں

کِیا ہے چُور پھر کاسہ کوئی تیری بخیلی نے
مَیں پھر تیری گلی میں اِک گدا کا شور سُنتا ہُوں

ضرورت کی چٹانوں سے کہیں ٹکرا گئی ہو گی
مَیں ناصرؔ آج پھر زخمی اَنا کا شور سُنتا ہُوں

غزل

بڑی مُشکل سے دِل بستی میں میرا نازنیں آیا
خُدا کا شُکر ہے اپنے مکاں میں وہ مکیں آیا

ہزاروں رنجشیں، شکوے، گِلے ہوں گے اُسے مُجھ سے
مگر جس کام سے آیا شہر میں وہ یہیں آیا

مِری ہر سانس کو اُس نے مہک اپنی پلا دی ہے
لیا جب سانس تو ایسا لگا میرا حسیں آیا

مِرے جذبوں کی سچّائی کا شاید یہ کرشمہ ہو
کہ اُس نے جھوٹ بھی بولا مُجھے فوراً یقیں آیا

لبوں پہ مُسکراہٹ تھی نہ آنکھوں میں چمک پہلی
وہ پھر اس بار محفل میں مِری خاطر نہیں آیا

بھلا آنکھوں کے جھرنوں سے بھی دِل سیراب ہوتا ہے!
یہ دریا تو کبھی اپنے کناروں تک نہیں آیا

غزل

مہکے ہُوئے ہیں راستے خوشبو ہے آس پاس
جیسے خیال میں تِرا گیسو ہے آس پاس

فُرقت کی رات دیتی ہے قُربت کے ذائقے
چنبیلیوں کا شہر ہے یا تُو ہے آس پاس !

سورج نگل لِیا ہے ہواؤں نے جِس طرح
صحنِ چمن ہے اَور بہت لُو ہے آس پاس

جنگل میں جا کے رہزنوں سے لی پناہ آج
پھر بھی دِل و نگاہ کا ڈاکو ہے آس پاس

سُنتی نہیں ہے اپنی تو صبروسکون سے
کیسا تُمھاری یاد کا جادو ہے آس پاس

جِن کا قصاص کوئی بھی لینے نہ آئے گا
قانونِ قتلِ بے کساں لاگو ہے آس پاس

کانوں میں ایک گونج ہے ضربِ الَست کی
پھر سے صدائے دِل نشیں حق ہُو ہے آس پاس

بِکھری ہُوئی ہے چاندنی ناصؔر خیال میں
پھر چاند بن کے وہ مِرا خوش رُو ہے آس پاس